ڈاکٹر محمد سہیل شفیق
ایسوسی ایٹ پروفیسر
شعبۂ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی

سرسیّد ''مسافرانِ لندن'' کے تناظر میں

ABSTRACT

Sir Syed in the context of "Musafiran e London"
By Dr. Sohail Shafiq, Associate Professor, Department of Islamic Studies, University of Karachi.

Sir Syed Ahmad Khan (1817-1898 AD) was a versatile personality.He is known as a far-sighted Reformer of the nation, educator, historian, researcher, writer, religious scholar, Qur'anic commentator. Although much has been written about the all-round personality of Sir Syed Ahmad Khan, much remains to be written.When Sir Syed took steps for social reform, he was alone in the crowd of thousands. One of the great achievements of Sir Syed is that he not only diagnosed national diseases but also accurately assessed their causes.

Sir Syed believed in the living moments of the present time and was striving for the identity of the sub-continent. In the same search, he left for London on First of April, 1969 and stayed in London till 4th September. He continued to write travelogue and send to Aligarh which were published in Akhbar Aligarh institute. Later, this travelogue of Sir Syed, entitled 'Musafiran e London', was published by Majlis-e-TaraqiAdab, Lahore, almost a century after his death.

The special thing about this travelogue is that along with all the details of the journey, some special aspects of Sir Syed's personality also come to the fore. During this journey, he is repeatedly reminded of his homeland. Hardly a day goes by without a purpose. It seems that during this journey, he never lost sight of his people. The outlines of the nation-reform plan continued to form in his mind. The reader feels that Sir Syed himself is undergoing a process of self-accountability as a nation. That is why this travelogue of Sir Syed is also a statement of his mental and esoteric events.

The purpose of this article is to highlight the different aspects of Sir Syed's personality in the context of 'Musafiran e London'.

سرسید احمد خان (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء) ایک ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے۔ مصلحِ قوم، ماہر تعلیم، تاریخ داں، محقق و

مصنف، دور بین اور دور اندیش۔ سرسید احمد خان کی ہمہ پہلو شخصیت کے حوالے سے اگرچہ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن ابھی بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے۔ سرسید اپنے وقت کے ایک بڑے نباض اور مصلحِ قوم تھے۔ سرسید نے جس وقت اصلاحِ معاشرہ کے لیے قدم اٹھایا۔ اس وقت وہ ہزاروں کے مجمعے میں بھی تن تنہا تھے۔ سرسید کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قومی امراض کی نہ صرف تشخیص کی بلکہ اس کے اسباب و وجوہ کا ٹھیک ٹھیک اندازہ بھی لگایا۔

سرسید زمانۂ حال کے جیتے جاگتے لمحوں پر یقین رکھتے تھے اور برصغیر کے مسلمانوں کی شناخت کے لیے سرگرداں تھے۔ اسی تلاش و جستجو میں وہ یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو عازمِ لندن ہوئے اور ۴ ستمبر ۱۸۷۰ء تک لندن میں رہے۔ وہاں سے سفر کے حالات تمام تر جزئیات کے ساتھ لکھ لکھ کر علی گڑھ بھیجتے رہے جو اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ میں شائع ہوتے رہے۔ بعد ازاں سرسید کا یہ سفرنامہ 'مسافرانِ لندن' کے عنوان سے ان کے انتقال کے تقریباً ایک صدی بعد مجلس ترقیٔ ادب لاہور نے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا۔

اردو سفرناموں کی تاریخ میں سرسید کا یہ سفرنامہ ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے اسی سفر لندن کے دوران میں سرسید نے نہ صرف سر ولیم میور کی کتاب 'لائف آف محمدؐ' کا جواب لکھا بلکہ اس کا انگریزی ترجمہ بھی کرایا اور لندن سے اپنی ہندوستان روانگی سے قبل شائع بھی کرایا جو کہ سرسید کی ایک بڑی کامیابی تھی۔

'مسافرانِ لندن' کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں سفر کی تمام جزئیات کے پہلو بہ پہلو سرسید کی شخصیت کے کچھ خاص پہلو بھی واضح ہو کر سامنے آتے ہیں۔ اس سفر کے دوران میں انھیں بار بار اہلِ وطن یاد آتے ہیں۔ شاید ہی ان کا کوئی دن ایسا ہو جو کسی مقصد سے خالی رہا ہو یا شاید ہی ان کی کوئی رات ایسی ہو جو بستر پر کروٹیں بدلتی نہ گزری ہو۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس سفر کے دوران وہ کسی بھی لمحے اپنی قوم سے غافل نہیں رہے۔ اصلاحِ قوم کے منصوبے کے خدوخال ان کے ذہن میں تشکیل پاتے رہے۔ ہر لمحہ لندن کی تہذیب و تمدن سے ہندوستانیوں کی تہذیب و تمدن کے موازنے کا عمل جاری رہا۔ قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ سرسید بذاتِ خود بحیثیتِ قوم خود احتسابی کے عمل سے گزر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کا یہ سفرنامہ ان کی ذہنی اور باطنی واردات کا بیان بھی ہے۔ پیشِ نظر مقالے میں 'مسافرانِ لندن' کے تناظر میں سرسید کی شخصیت کے متنوع پہلوؤں کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

سرسید احمد خان یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو بنارس سے عازمِ لندن ہوئے۔ ان کے ساتھ ان کے دونوں بیٹے سید محمد حامد اور سید محمود، ان کے ذاتی خدمت گار عظیم اللہ عرف چھجو کے علاوہ ان کے ایک قریبی دوست مرزا خداداد بیگ بھی تھے۔ مقصدِ سفر بالکل واضح تھا کہ دنیا کا ایک ایسا شہر جو عالمی تہذیبوں کا مقام اتصال و ارتباط بنا ہوا تھا، اس کا مطالعاتی دورہ اور اس کی روشنی میں برصغیر کے تہذیبی مزاج کی تجدید و احیاء۔ الحکمۃ ضالۃ المومن.... حکمت مومن کی گمشدہ میراث ہے جہاں پاؤ لے لو۔

سرسید اپنے مقصدِ سفر کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''میں یہ بات چاہتا ہوں کہ خود انگلستان جا کر اپنے ہم وطنوں کے

واسطے ایک نظیر قائم کروں اور مجھ کو یقین ہے کہ صرف مجھ کو ہی اس سیر سے فائدہ نہ ہوگا بلکہ امید ہے کہ اپنے سفر کے نتیجوں سے ان کو مطلع کر کے ان کو بھی فائدہ پہنچا سکوں اور اس طرح پر جو عمدہ باتیں میں نے سیکھی ہوں ان کو سکھاؤں اور ان کو اپنی پیروی کی ترغیب دوں۔''(۱)

سرسید سے قبل جن لوگوں نے لندن کا سفر کیا اور رودادِ سفر قلم بند کی ان سفرنامہ نگاروں کے محرکات سفر دوسرے ہیں۔ اکثر انگلستان کے حسن و جمال اور صفائی ستھرائی سے مرعوب اور اس کے قصیدہ خواں نظر آتے ہیں۔(۲) جب کہ سرسید برصغیر کی شناخت کے لیے سرگرداں تھے۔ محسن الملک مہدی علی خاں کے نام جو خطوط سرسید نے لکھے ہیں اُن میں بار بار یہی لکھتے ہیں کہ ''میں ہر دم اپنے ملک کی بھلائی کے خیال میں ہوں اور عنقریب کچھ کچھ ان شاء اللہ تعالیٰ مشتہر کرنا شروع کرتا ہوں۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں: ''یہاں کا حال دیکھ کر اپنے ملک اور اپنی قوم کی حماقت اور بے جا تعصب اور تنزلِ موجودہ اور ذلتِ آئندہ کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا ہے اور کوئی تدبیر اپنے ہم وطنوں کے ہوشیار کرنے کی نہیں معلوم ہوتی۔''(۳)

سرسید دورانِ سفر ایک ہندوستانی کی حیثیت سے چیزوں کا مشاہدہ و موازنہ کر رہے تھے۔ ہر مفید چیز کو وہ اپنانا چاہتے تھے جو دوسرے ملکوں میں چاہے مصر میں ہو، فرانس میں ہو یا انگلستان میں۔(۴) بقول ڈاکٹر اصغر عباس: ''اثنائے سفر میں چاہے مصر کی نہروں کا انتظام ہو یا پیرس کے نگار خانے ہوں یا لندن کے عجائبات ہوں، کیمبرج یونیورسٹی، انڈیا آفس لائبریری، اتھینم کلب، مدارس نسواں، ارباب کمال کی ملاقات، برٹش میوزیم، انجینئرنگ کی ترقیات، وِنچسٹر کالج، پل کا افتتاح، جنگی جہازوں کی تیاری، توپوں کا دغنا، عام کاری گروں کی صنعت و حرفت، لندن کا لبرل ماحول سب کو انھوں نے وارفتگی سے دیکھا اور بار بار انھیں اپنے اہلِ وطن یاد آئے۔''(۵)

سرسید یکم اپریل ۱۸۶۹ء سے ۴ ستمبر ۱۸۷۰ء تک لندن میں قیام پذیر رہے اور وہاں سے سفر کے حالات تمام تر جزئیات کے ساتھ لکھ لکھ کر علی گڑھ بھیجتے رہے جو 'اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ' میں شائع ہوتے رہے۔ بعد ازاں سرسید کا یہ سفرنامہ 'مسافرانِ لندن' کے عنوان سے ان کے انتقال کے تقریباً ایک صدی بعد مجلس ترقیٔ ادب لاہور نے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا۔

سرسید کا یہ سفرنامہ ان کی ذہنی اور باطنی واردات کا بیان بھی ہے اور ان کی شخصیت کے متنوع پہلوؤں کی تفہیم میں معاون و مددگار بھی۔ اس سفرنامے سے سرسید کے تعلیمی افکار، علمی و دینی سرگرمیوں، مذہبی رواداری و احترام، جذبہ حب الوطنی، اہل علم و فن اور جدوجہد آزادی میں سرگرم رہنمایانِ عالم کی قدردانی، عربی زبان سے واقفیت، مادری زبان کی اہمیت، اردو زبان سے محبت، اصلاحِ احوال کی کوششیں اور نقد و نظر کی صلاحیتیں نمایاں ہوتی ہیں۔

سرسید کے تعلیمی افکار

سرسید کا سفرنامہ لندن ان کے تعلیمی افکار کی تشکیل میں بھی بڑا اہم ثابت ہوا۔ لندن کی تعلیمی فضا کا اثر یہ ہوا کہ

انھوں نے وہاں ہندوستان کے موجودہ انگریزی نظامِ تعلیم پر ایک رسالہ بھی لکھا۔(۶)

سرسید سے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ تعلیم نسواں کے حامی نہیں تھے۔اس سفرنامے سے اس خیال کی نفی ہوتی ہے۔سرسید نہ صرف تعلیم نسواں کے حامی تھے بلکہ وہ اس کی اہمیت و افادیت سے بھی آگاہ تھے۔اس سفر کے دوران میں انھوں نے لندن میں تعلیم نسواں کے اداروں کو دیکھا بھی اور اہل وطن کو ان کی تفصیلات بھی بہم پہنچائیں۔لیکن یہ بات واضح رہے کہ سرسید کو تعلیمِ نسواں کا خیال لندن جانے کے بعد نہیں آیا وہ پہلے سے اس کے مشتاق تھے۔چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''میں مدت سے اس بات کا مشتاق تھا کہ اس ملک کی عورتوں کے مدرسوں کا معائنہ کروں اور جس طریقہ میں وہاں تعلیم ہوتی ہے اس کو بخوبی دریافت کر کے اس کے نتیجے سے اپنے ان ہم وطنوں کو مطلع کروں جو ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم کے موئید ہیں اور اس کو ترقی دیتے ہیں۔''(۷)

اثنائے سفر میں سرسید جب مصر پہنچے تو انھوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ مصر میں خواتین کی تعلیم میں پیش رفت ہوئی ہے اور وہ ہندوستانی عورتوں کی طرح جہل مرکب میں مبتلا نہیں ہیں۔

اسی طرح جب لندن پہنچے تو اس بات سے متاثر ہوئے کہ انگلستان میں عورتوں اور مردوں کو یکساں مواقع حاصل ہیں اور ان کے لیے مساویانہ حقوق کا خیال رکھا جاتا ہے۔جب وہ لندن سے کلفٹن گئے تو دیکھا کہ وہاں کی رصدگاہ ایک خاتون کے زیرنگرانی کام کر رہی تھی۔وہ لکھتے ہیں: ''یہ تمام کارخانہ ایک عورت کے سپرد ہے اور جس قدر آلات کہ اب اس میں موجود ہیں اور جو جو عمل اس سے ہو سکتے ہیں وہ عورت کر کے دکھاتی ہے۔''(۸)

علمی و دینی سرگرمیاں

سرسید کا یہ سفر کئی لحاظ سے ایک بہت کامیاب سفر تھا۔لندن کے دورانِ قیام میں انھوں نے ''خطباتِ احمدیہ'' کا پہلا مسودہ تحریر کیا اور وہیں چھپوایا۔ایک خط میں لکھتے ہیں: ''میں روز و شب تحریرِ کتابِ سیر مصطفویٰ صلعم میں مصروف ہوں۔سب کام چھوڑ دیا ہے۔لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے۔ادھر فکر ترتیبِ مضامینِ کتاب، ادھر فکر جواب اعتراضات۔ادھر فکر تنقیح و تصحیح روایات صحیح میں مبتلا رہتا ہوں ادھر جب حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل جاتی ہے کہ الٰہی! لکھنا اور چھپوانا تو شروع کر دیا، روپیہ کہاں سے آوے گا۔مسلمان البتہ آستین چڑھا کر اس باب میں لڑنے کو تیار ہوں گے کہ انگریزوں کے ساتھ کھانا مت کھاؤ مگر جب کہو کہ مذہبی تائید میں کچھ روپیہ خرچ کرو تو جان بچاویں گے۔''(۹)

علاوہ ازیں ایک عیسائی جان ڈیون پورٹ (John Davenport) کی کتاب این اپالوجی فار محمد اینڈ دی قرآن

(An Apalogy for Mohammad and the Koran) کو اپنے خرچ پر چھپوایا۔ اس کے علاوہ گاڈفرے ہگنز (Godfrey Higgins) کی کتاب کا ہندوستان آنے کے بعد اس کا ترجمہ 'حمایت الاسلام' کے نام سے شائع کرایا۔[۱۰]

سرسید نے لندن میں علمی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا۔ وہ کارلائل سے بھی ملے اور اس کی تصنیف ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی۔ سرسید کی معرکہ آرا تصنیف ''آثار الصنادید'' کی وجہ سے فرانس اور انگلستان کے علمی حلقوں میں ان کا چرچا پہلے ہی سے تھا۔ یہاں بہت سی ممتاز شخصیتوں نے ان کا استقبال کیا، انھیں متعدد جلسوں اور شاہی تقریبوں میں مدعو کیا گیا۔ اگست ۱۸۶۹ء میں سی۔ایس۔آئی۔ کا خطاب پیش کیا گیا۔[۱۱]

مذہبی رواداری واحترام

سرسید آپس کی صحبت اور ملاقات میں مذہبی گفتگو کو نہایت ناپسند کرتے تھے بلکہ برخلاف اخلاق سمجھتے تھے۔ دوسرے سرسید یہ سمجھتے تھے کہ جو شخص اپنے مذہب سے لگاؤ رکھتا ہو اسے ضرور منکسر، بااخلاق اور اپنے مذہب کے اصولوں کے مطابق دوسروں سے محبت کرنے والا ہونا چاہیے۔[۱۲] سرسید ہر ایک کے اپنے مذہب میں پختہ ہونے کو نہایت عمدہ جانتے تھے مگر تعصب کو نہایت برا اور ایک بڑا نقص، اخلاق انسانی میں اور نیچر یعنی حکمت الٰہی کے برخلاف سمجھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جیسا خدا بے تعصب ہے مشرک، بت پرست، خدا پرست سب کو برابر پرورش کرتا ہے اسی طرح گورنمنٹ کو اور افسر تعلیم کو بے تعصب ہونا چاہیے۔ جب ہی گورنمنٹ ظل اللہ اور افسر تعلیم معلم صفت من صفات اللہ ہوسکتا ہے۔[۱۳]

جہاز کے سفر میں اتوار کے دن عیسائی اپنی عبادت میں مصروف ہوئے اور اپنے مذہب و دستور کے مطابق نماز ادا کی۔ سرسید لکھتے ہیں: ''میں بھی اس مقام کے قریب جہاں نماز ہوتی تھی خاموش مؤدب کھڑا تھا اور کبھی ٹہلنے لگتا تھا کیوں کہ خدا کا نام ہر طرح ادب کے لائق ہے اور نماز کے ادا کرنے کو دیکھ رہا تھا اور خدا کی بے نیازی کی شان پر خیال کرتا تھا کہ عجیب بے نیاز اور مستغنی ہے کہ اگر کوئی بت کے سامنے ڈنڈوت کرے تو اس کو کچھ پروا نہیں اور اگر کوئی ٹوپی اتار کر اور کرسی پر بیٹھ کر نیاز کرے تو کچھ پروا نہیں اور اگر کوئی جبّہ اور عمامہ پہن کر اور تسبیح گلے میں ڈال کر کھڑا ہو کر، ہاتھ باندھ کر، ناک رگڑے تو بھی کچھ پروا نہیں اور اگر کوئی برا کہے، گالی دے، شرک کرے تو بھی کچھ پرواہ نہیں، بلاشبہ صفت استغنا اُسی پر ختم ہے

ز عشق نا تمام ما جمال یار مستغنی است
باب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا

میں اسی خیال میں تھا کہ نماز ختم ہوگئی، نمازیوں میں سے ایک ہمارے دانا دل دار صفت دوست نے پوچھا کہ تم نماز میں کیوں شریک نہیں ہوئے۔ میں نے کہا کہ میں کیا شریک ہوتا۔ کہا کیوں؟ خدا تو ایک ہے، میں نے کہا کہ یہی تو وہاں نہ تھا۔ یہ سن کر چپ ہو رہے۔[۱۴]

عدن میں ہندوؤں کو آتے جاتے دیکھتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ جہاز میں بیٹھنے سے ان کی ذات و مذہب میں کچھ فرق نہیں آتا، نہایت خوش ہوتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خدا ہمارے ملک کے ہندوؤں کو بھی یہ دن نصیب کرے۔(۱۵)

سرسید احمد خان جس رائے کو بہتر سمجھتے تھے اس کا اظہار کرنے میں انھیں کوئی باک نہیں تھا۔ سرسید عیسائیوں کے ہاتھ کے ذبح کیے ہوئے جانور کو جس طرح پر کہ ان کے علماء کے نزدیک مارنا درست ہو، شرعاً درست سمجھتے تھے۔ دورانِ سفر انھوں نے انگریزوں کے ہاتھ کے ذبح کیے ہوئے یا گردن مروڑی ہوئی مرغی اور کبوتر کھایا۔ لکھتے ہیں:

> ''جہاز میں جو ہم نے انگریزوں کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا یا گردن مروڑی ہوئی مرغی اور کبوتر کھایا، یہ امر اضطراری نہ تھا بلکہ اختیاری تھا۔ پس ہمارے مسلمان بھائی متعصب (نہیں نہیں اہل تقویٰ و ورع) اگر اس کو ناجائز سمجھتے ہیں تو ان کو اختیار ہے کہ اس کو نہ کھاویں مگر ان کو جہاز میں کچھ تکلیف ہوگی نہ کچھ زیادہ خرچ لینا پڑے گا؛ زندہ مرغیاں جہاز میں کپتان جہاز کی طرف سے بلا قیمت بہ عوض اس قیمت کے جو اوّل کھانے کی دی ہے، مل سکتی ہیں، چنانچہ ہم نے بھی ایک آدھ دفعہ لی اور چھجو سے ہندوستانی طریق پر قورمہ پکوایا۔ مچھلیاں اور انڈے برابر مل سکتے ہیں اور خود بھی رکھ سکتے ہیں؛ عدن میں، سویز میں، اسکندریہ میں، سب جگہ مل سکتی ہیں۔ بمبئی سے سویز تک بہت سے خلاصی مسلمان ہو سکتے ہیں ان کو ایک بھیڑ نہایت عمدہ ملتی ہے، وہ خود ذبح کرتے ہیں اور اس میں سے بھی گوشت مل سکتا ہے۔ وہ ایسے خلیق ہوتے ہیں کہ بلا قیمت بھی دے دیتے ہیں اور اگر قیمت لے کر دیں تو کچھ مشکل و دقّت نہیں۔ پس یہ تصور کرنا نہیں چاہیے کہ بغیر اس طریقے کے جو ہم نے اختیار کیا، لندن کا سفر ہو ہی نہیں سکتا۔(۱۶)

لیکن جس بات کو صحیح نہیں سمجھتے وہاں اس کا اظہار کرتے ہوئے بہت لطیف انداز میں طنز بھی کرتے ہیں:

> ''ہمارے ہم وطن ہندو بھائیوں کو کسی قدر اس سے زیادہ تکلیف اٹھانی ہوگی۔ میں نہیں جانتا کہ جو حالت پانی دستیاب ہونے کی میں نے اوپر بیان کی، ایسی حالت میں وہ پانی ہندو بھی استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟ ہندوستان میں جو لوگ ہندوؤں کی ترقی کے خواہاں ہیں وہ اس مسئلے کی تحقیقات کریں گے۔ اگر وہ پانی قابل استعمال کے ہو تو بلاشبہ نہایت بڑی مہم انھوں نے فتح کر لی اور اگر نہ ہو تو ان کو ایک مہینے تک کا پانی اپنے ساتھ تانبے کے پیپوں میں جو کاٹھ کے صندوق میں رکھے جاویں بھر لینا ہوگا اور ایسے طور پر بند کرنا ہوگا کہ اگر کوئی دوسرا شخص اس صندوق کو چھولے تو پانی ناقابل

استعمال نہ ہوجائے۔ ہندوؤں کو جہاز میں چوکا کر کے کھانا پکانا غیر ممکن ہے.... پس حساب سے پچیس روز کا کھانا ہندوستان کا پکا ہوا مثل پوری کچوری مٹھائی یا بالوشاہی دال موٹھ کے رکھ لینی چاہیے اور یہ بات کچھ مشکل نہیں ہے۔ پس اگر کوئی بندہ ذرا ہمت کرے اور کچھ سختی بھی اپنے اوپر گوارا کرے تو بخوبی یورپ کا سفر کرسکتا ہے اور کوئی بات بھی برخلاف اس کے مذہب اور اعتقاد کے اس کو پیش نہیں آتی۔ خدا ہمارے ہم وطن بھائی ہندوؤں کو بھی توفیق دے کہ وہ اپنے ملک سے قدم باہر نکالیں اور دنیا کا تماشہ اور خدا کی قدرت کا کارخانہ دیکھیں اور شائستگی و سویلیزیشن کی روشنی سے روشن ضمیر ہوں۔ وماعلینا الا البلاغ۔''(۱۷)

اہل علم وفن کی اور جدوجہد آزادی میں سرگرم رہنمایانِ عالم کی قدردانی

سرسید کی ایک بڑی خوبی اہل علم وفن کی قدردانی ہے۔ سرسید اس حوالے سے بلاتفریق مذہب وملت اظہار قدردانی کرتے نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ دورانِ سفر جہاز پر فرانسیسی انجینئر مسٹر ڈی لسپس (M. D. Lesseps) سے ملاقات ہوتی ہے، جنھوں نے نہر سویز بنانے کی تجویز دی اور جیسا کہا تھا ویسا کر کے دکھایا۔ سرسید ڈی لسپس سے مل کر بہت خوش ہوتے ہیں اور لکھتے ہیں:

''ایسے شخص کی ملاقات سے جو دلیری اور جرأت میں بھی ایسا ہی کامل ہے جیسا کہ اپنے فن میں اور حقیقت میں یکتائے دہر و بے مثل و بے نظیر ہے مجھے نہایت خوشی ہوئی بلکہ میں نے اپنا فخر سمجھا۔''(۱۸)

مزید لکھتے ہیں:

''مسٹر ڈی لسپس نے اسپیچ کی تو اس میں انھوں نے کہا کہ میری خوشی اور میرا فخر اس میں نہیں ہے کہ اس نہر کا نام لسپس ہو بلکہ میری خوشی اور میرا فخر اس میں ہے کہ یہ نہر فرنچ نہر کہلاوے۔ جس وقت کہ میں نے بذریعہ ایک دوست کے جو وہاں موجود تھا یہ مضمون سمجھا میرے دل میں اس دلاور آدمی کی اس فیاضی پر کہ اپنی قوم کی نام آوری پر ایسا غش ہے کہ اپنی خوشی اور اپنی عزت اس میں سمجھتا ہے۔ ہزار ہزار آفریں کی اور اپنی قوم پر جن کا کام بجز حسد اور بغض اور اپنی ذاتی جھوٹی شیخی جتانے کے اور کچھ نہیں ہے افسوس کیا اور یقین جانا کہ ایسی ہی بدخصلتوں سے ان کو ایسی بدنصیبی و ذلت نے

گھیرا ہے۔ لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا۔''(۱۹)

جب سرسید کا جہاز کیپریا (Capria) کے مقابل اور آبنائے بونی فیشیو (Bonifacio) میں رات کو گزرا اور اس سبب سے کہ کیپریا جہاں اس زمانے کے دلاور اعظم اٹلی کے ممتاز محب وطن گاری بالڈی کا گھر ہے۔ سرسید لکھتے ہیں:

''مجھ کو کمال آرزو تھی کہ میں اس زمانہ کے سب سے بڑے فیاض دلاور گاری بالڈی کے پھونس کے جھونپڑے کی جو بڑے بڑے قیصروں کے محلوں سے بھی زیادہ معزز اور قابل ادب و تعظیم ہے زیارت کروں، مگر افسوس کے رات ہونے کے سبب یہ دولت اور یہ نعمت مجھ کو نصیب نہ ہوئی۔''(۲۰)

سرسید کی شخصیت کا ایک یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ وہ بلا کسی تفریق دنیا بھر میں جدوجہد آزادی میں سرگرم تمام رہنماؤں کی قدر کرنے والوں میں سے تھے چاہے وہ اٹلی کے گیری بالڈی ہوں یا الجزائر کے امام عبدالقادر، یا آئرلینڈ کے مجاہدین آزادی۔(۲۱)

جذبۂ حب الوطنی کی قدر افزائی

جہاں سرسید کو ہندوستان پر فخر کا موقع میسر آیا سرسید نے اس سے صرفِ نظر نہیں کیا۔ پیرس کی عمارتوں کی خوبصورتی کو دیکھتے ہوئے ایک موقع پر لکھتے ہیں: ''بایں ہمہ صرف عمارت، جیسی عمدہ و مستحکم اور نہایت ہی خوبصورت ہمارے ملکوں کی ہے، اب تک یہاں دیکھنے میں نہیں آئی۔ بلاشبہ تاج محل کے روضے اور قطب کی لاٹھ سے ہندوستان کی عمارت کو فخر ہے۔''(۲۲)

سرسید نہ صرف خود اپنے وطن سے محبت کرتے تھے بلکہ دیگر اقوام کے افراد کے جذبۂ حب الوطنی کی بھی قدر کیا کرتے تھے۔ لندن کے سفر کے دوران جہاز پر ان کی ملاقات نہر سوئز کے معمار فرانسیسی انجینئر ڈی لسپس (M. de Lesseps) سے ہوئی۔ سرسید کو ڈی لسپس کی وہ تقریر بہت پسند آئی جو اس نے جہاز کے مسافروں کے سپاسنامہ کے جواب میں کی تھی۔ سپاسنامہ میں کہا گیا تھا کہ نہایت زیبا ہے کہ اس نہر کا نام لسپس رکھا جائے۔ اپنی جوابی تقریر میں اس نے کہا کہ میری خوشی اور فخر اس میں ہے کہ یہ نہر فرنچ نہر کے نام سے منسوب کی جائے۔ سرسید نے اس کے جذبۂ حب الوطنی کو بہت سراہا اور اس پر افسوس کیا کہ ان کے ہم وطنوں میں یہ جذبہ خال خال ہے۔(۲۳)

اردو زبان سے محبت

سرسید اردو زبان کی ترویج کے لیے ساری عمر طرح طرح کے جتن کرتے رہے تاکہ وہ جدید علوم کی تعلیم و تدریس کے لیے تیار ہو کر ذریعہ تعلیم بن سکے۔ دورانِ سفر بھی ہر مرحلے پر ہر طرح سے تعلیم کی اہمیت کو اور اپنی زبان کی اہمیت کو واضح کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایک موقع پر دیکھتے ہیں کہ جہاز اپنے پیچھے ایک اسٹیمر کو رسی کے ذریعے کھینچ رہا ہے۔ تحقیق پر معلوم

ہوتا ہے کہ یہ فن امریکہ اور یوروپ کی قوموں کے سوا کسی اور قوم میں نہیں ہے۔ جہاز پر ایک کتاب رہتی ہے اس میں جہاز سے متعلق تمام کام درج ہوتے ہیں اور وہ سب کام ایسے آسان طریقے پر ہوتے ہیں کہ جہاز میں جو چھوٹے چھوٹے عہدے دار ہیں اور صرف بہ طور حرف شناسی کے لکھنا پڑھنا جانتے ہیں وہ سب ان کاموں کو انجام دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''یہ نتیجہ صرف اس بات کا ہے کہ تمام علوم وفنون اسی زبان میں ہیں جو زبان وہ لوگ بولتے ہیں اگر انگریزی زبان میں تمام علوم وفنون نہ ہوتے بلکہ لیٹن میں یا گریک میں یا فارسی، عربی میں ہوتے تو آج تک تمام انگریز ایسے ہی جاہل اور بے علم اور لاکھوں ناخواندہ ہوتے۔ جیسے کہ بدنصیبی سے ہم لوگ ہندوستان میں جاہل ہیں اور آئندہ کو بھی جب تک تمام علوم وفنون ہماری زبان میں نہ ہوں گے جاہل اور نالائق رہیں گے اور کبھی عام تربیت نہ ہوگی۔''(۲۴)

عدن میں سُمالی قوم کو اردو بولتے سنتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں کہ کوئی ضروری کام بند نہیں رہ سکتا سب اردو میں انجام ہوسکتا ہے۔ الحمدللہ کہ عدن تک تو اردو زبان کی شہنشاہی قائم ہے۔(۲۵)

اسی طرح ایک موقعے پر مصر کی ''وابور البر'' یعنی ریل کے حال کا ذکر کرتے ہیں کہ اگرچہ ہر چیز انگلستان یا فرانس کی بنی ہوئی ہے کوئی چیز بھی مصر یا ترکستان کی بنی ہوئی نہیں ہے لیکن مصری خود ان سب چیزوں سے کام کرنے اور کام لینے کے لائق ہیں تو ایک بار پھر اپنی زبان کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''مصر والوں کو جو اس قدر لیاقت آئی ہے صرف اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان چیزوں سے کام لینے کے فنون انھی کی زبانوں میں مروج ہوگئے ہیں۔''(۲۶)

عربی زبان سے سرسید کی واقفیت

عام خیال یہ ہے کہ سرسید عربی زبان سے ناواقف تھے۔ لیکن اس سفرنامے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرسید عربی زبان سے نہ صرف واقف تھے بلکہ کلام پر بھی قدرت رکھتے تھے۔(۲۷)

سرسید کی نظر میں مادری زبان کی اہمیتا نگلستان کا حال بیان کرتے ہوئے مادری زبان کی اہمیت کے حوالے سے سرسید لکھتے ہیں:

> ''کیب مین اور کوچوان اپنی گدی کے نیچے کوئی اخبار یا کوئی کتاب دبائے رکھتے ہیں جہاں سواری پہنچائی اور کیب یا اور جو سواری ہو وہ کھڑی کی اور انھوں نے اخبار نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔ آپ خیال کرلیں یہاں کیب مین کی ایسی حیثیت ہے جیسی کہ بنارس میں وہاں کے یکہ کرایہ پر چلانے والوں کی حیثیت۔ پس جب تک کہ اس قدر ترقی عام تعلیم کی نہ ہو شائستگی اور تربیت اس قوم میں آنی اور اس قوم کی عزت ہونی ناممکن ہے۔ اس تمام ترقی کا باعث انگلستان میں صرف یہ ہے کہ تمام چیزیں تمام علوم

تمام فن جو کچھ ہے اسی قوم کی زبان میں ہے جو عموماً یا قریب عموماً کے بولی جاتی ہے۔ گو اسی انگلستان میں بعض مقاموں کی زبانیں ایسی گنواری ہیں جن پر انگریزی کا اطلاق کرنا مشکل ہے مگر انگریزی زبان انگلستان میں ایسی ہے جیسے ہندوستان میں علی الخصوص شمالی و مغربی اضلاع اور صوبہ بہار میں اردو جس کو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے پس جو لوگ حقیقت میں ہندوستان کی بھلائی اور ترقی چاہنے والے ہیں وہ یقین جان لیں کہ ہندوستان کی بھلائی صرف اسی پر منحصر ہے کہ تمام علوم اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک ان ہی کی زبانوں میں ان کو دیے جاویں۔ میری یہ رائے ہندوستان کے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر نہایت بڑے بڑے حرفوں میں آئندہ زمانہ کی یادگاری کے لیے کھودے جاویں۔ اگر تمام علوم ہندوستان کو اسی کی زبان میں نہ دیے جاویں گے کبھی ہندوستان کو شائستگی و تربیت کا درجہ نصیب نہیں ہونے کا یہی سچ ہے۔ یہی سچ ہے۔ یہی سچ ہے۔''(۲۸)

معلومات کی فراہمی

اس سفرنامے کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ قدم قدم پر اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ سرسید نے جس کمپنی کے جہاز میں سفر کیا اس کے کاروبار کی کیفیات کو بھی تفصیل سے بیان کیا(۲۹) فرانس کے شہر مارسیلز پہنچے تو اس کے بارے میں ضروری تفصیلات فراہم کیں۔(۳۰) سرسید بردہ دخانی جہاز کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بردہ اسٹیمر نہایت عمدہ جہاز ہے، لندن میں بنا ہے۔ سنہ ۱۸۶۳ء میں بننا شروع ہوا اور سنہ ۱۸۶۴ء میں تیار ہو کر سمندر میں ڈالا گیا۔ تین سو نو فٹ لمبا اور اڑتیس فٹ چوڑا اور چھبیس فٹ گہرا ہے۔ باون ہزار چار سو چوالیس من بوجھ اٹھاتا ہے۔ بیچو بیچ میں چار سو گھوڑوں کے زور کا انجن لگا ہوا ہے۔ ایک بڑا کمرہ طولانی بیچوں بیچ میں ہے مگر انجن اور زینہ ہونے کے سبب دو حصہ ہو گیا ہے۔ ان کمروں میں کھانے کی میزیں لگی ہوئی ہیں اور کھانے کے بعد بیٹھنے اور کھیلنے اور باتیں کرنے کی جگہ ہے اور اس کے دونوں طرف برابر برابر چھوٹے چھوٹے کمرے فرسٹ کلاس کے مسافروں کے لیے بنے ہوئے ہیں۔(۳۱) سرسید نے بہت تفصیل سے یہ معلومات فراہم کی ہیں یہاں تک کہ ہر روز جہاز کس رفتار سے چلا اور جہاز کے افسران کے نام اور عملے کی تعداد کو بھی ذکر کیا ہے۔(۳۲) اسی طرح یونانی جہاز میں سوار ہوتے ہیں تو اس کی تمام تر تفصیلات بیان کرتے ہیں۔(۳۳)

نقد و نظر

سرسید نے مشاہدات سفر کے بیان میں انصاف سے کام لیا ہے۔ جہاز میں سفر کے دوران سرسید انگریزوں کو دیکھتے

ہیں کہ جہاز میں سب کا مزاج اور اخلاق نہایت اچھا ہے۔ ہر موقعے پر گڈ مارننگ اور تھینک یو کہتے ہیں۔ تو سرسید ہندوستانی صاحبان انگریز پر لطیف طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''یا تو یہ صاحبان ہندوستان میں بھی ایسے خوش مزاج ہوں گے یا آب و ہوا کے اختلاف کے سبب یہ ہوگا۔ اس لیے کہ سمندری ہوا نہایت صحت بخش ہے۔''(۳۴)

جہاں تنقید کا موقع ہوا سرسید نے اس سے گریز بھی نہیں کیا۔ سرسید جب پیرس کے تصویر خانے میں الجزائر کے امام عبدالقادر کی عورتوں کی گرفتاری کی تصویر دیکھتے ہیں کہ اس کی عورتیں اونٹ پر کجاوے میں تھیں، فرنچ سپاہیوں نے اونٹ کو بٹھا کر کجاوہ گرادیا ہے اور عورتیں اس میں سے نکل پڑی ہیں اور ان کے بدن سے کپڑا ہٹ گیا ہے اور فرنچ سپاہی سنگین اٹھائے ہوئے ہیں اور ان کی نوکیں عورتوں کیطرف کیے ہوئے ہیں کہ گویا اب ماریں گے۔ تو سرسید بجا طور پر لکھتے ہیں کہ ''اس تمام تصویر خانے میں صرف یہی ایک بات تھی جو فرنچ کی شجاعت اور سویلیزیشن کو بٹا لگاتی تھی... کیا فرنچ کو یہ زیبا تھا کہ عورتوں کی گرفتاری کی تصویر اپنے محل میں لگاتے؟ کیا عورت پر سنگین سیدھی کرنی اور اس کو کجاوے میں سے گرادینا فرنچ سپاہیوں کی بہادری کی یادگاری تھی؟ کیا ایک عورت کا تصویر میں کپڑا بدن پر سے ہٹا ہوا بنادینا (بالفرض اگر ایسا ہوا بھی ہو) فرنچ کی سویلیزیشن کے مناسب تھا؟''(۳۵)

اسی طرح جہاں تعریف کا موقع ہوا وہاں تعریف میں بھی بخل سے کام نہیں لیا۔ مذکورہ بالا تصویر کے ساتھ جب وہ ایک دوسری تصویر دیکھتے ہیں امام عبدالقادر کی رہائی کی جس میں نپولین پورے قد سے کھڑا ہے اور اس کے پاس امام عبدالقادر کھڑا ہے اور اس کے سامنے امام عبدالقادر کی ماں مکمل لباس پہنے ہوئی کھڑی ہوئی ہے، شہنشاہ نپولین امام عبدالقادر کی ماں سے مصافحہ کررہا ہے اور امام عبدالقادر کی آزادی کا حکم دیتا ہے تو وہ لکھتے ہیں: ''درحقیقت اس تصویر میں شہنشاہ نپولین پر شہنشاہی برس رہی ہے اور تمام قوم فرنچ کا فخر اور عزت اور سویلیزیشن کی آراستگی اس سے معلوم ہوتی ہے۔''(۳۶)

کلفٹن کے آہنی لٹکواں پل کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اب میں اپنے ہم وطنوں سے نہایت دست بستہ اور ادب سے پوچھتا ہوں کہ یہ لوگ آدمی ہیں یا ہم؟ جو صرف حیوانوں کی طرح اپنی خودغرضی میں مبتلا ہیں اور پھر صاحب ہمت ایسے ہیں کہ ہر ایک کام میں کہتے ہیں کہ گورنمنٹ بندوبست کردے، لڑکیوں کے پڑھانے کا بندوبست بھی گورنمنٹ کرے، ان کو ان کا مذہب سکھانے کا بھی گورنمنٹ ہی بندوبست کرے۔ افسوس صد افسوس ہزار افسوس! حقیقت میں ڈوب مرنے کی جگہ ہے، ہم اس قابل بھی نہیں ہیں کہ کسی تربیت یافتہ ملک کے لوگوں کو اپنا منھ بھی دکھلاویں۔''(۳۷)

سرسید کے اس بے لاگ اور دوٹوک آئینہ دکھانے والے سفرنامے سے ظاہر ہے لوگ ناراض بھی ہوئے۔ سرسید کو علم

ہوا تو انھوں نے لکھنا موقوف کر دیا اور واضح کر دیا کہ جو کیفیت اس سفر میں میرے دل پر گزرتی ہے اور جو سچائی کہ میرے دل میں آتی ہے اس کو چھپاؤں اور جس گناہ کا الزام وہ اپنے ہم وطن ہندوستانیوں پر رکھتے ہیں خود بھی اس گناہ کے مرتکب ہوں۔(۳۸) لکھتے ہیں:

> ''اگرچہ میرے ہم وطن میری اس تحریر کو بہت سخت سمجھیں گے اور وہ تعجب کریں گے کہ کس چیز کی ہم میں کمی ہے اور کس چیز کی انگریزوں میں فوقیت ہے جو میں نے ایسا لکھا ہے مگر ان کا تعجب کرنا کچھ تعجب کی بات نہیں ہے وہ یہاں کی کسی چیز سے واقف نہیں ہیں اور جو کچھ یہاں ہے وہ حقیقت میں وہم و خیال سے باہر ہے جو کچھ میں نے یہاں دیکھا اور دیکھتا ہوں امکان نہ تھا کہ وہ ہندوستان میں وہم و گمان میں بھی آ سکتا۔... میں ان باتوں پر مطلق خیال نہیں کرتا جو بہ سبب خاصیت ملک کے ایک دوسرے میں مختلف ہیں بلکہ میں صرف اخلاقی اور تعلیمی اوصاف نفسانی اور صفائی اور خوش سلیقگی اور ہنر و کمال کا ذکر کرتا ہوں جو تعلیم و تربیت سے علاقہ رکھتا ہے۔''(۳۹)

اصلاحِ احوال کی کوششیں

سرسید دورانِ سفر بھی اصلاحِ احوال کی کوششیں کرتے رہے اور جہاں انھیں اس بات کا موقع ملا کہ وہ تعلیم کی اہمیت کو، اس کے لیے مربوط کوششوں کی افادیت کا لوگوں کو احساس دلائیں تو انھیں نے اس سے گریز نہیں کیا۔ جیسا کہ دس اپریل ۱۸۶۹ء کو بمبئی میں سرسید قلعہ و بازار کی طرف خریداری کے لیے جاتے ہیں تو رحمت اللہ سلیمان میمن سوداگر کی دکان پر کچھ دیر ٹھہرتے ہیں۔ وہ بڑی خاطر کرتا ہے۔ سرسید اس کو ترغیب دلاتے ہیں کہ یہ جو چھوٹے چھوٹے مدرسے میمنوں نے بنا رکھے ہیں ان کو موقوف کر کے ایک بڑا اور نہایت عمدہ عربی کالج بنائیں۔ نوجوانوں کو تعلیم دیں۔ اور انتظام سے قواعدِ مدرسہ جاری کریں تو فائدے کی بات ہے۔ یہ جو بوڑھے طوطے جن کا نام طالب علم رکھا ہے، کوئی بھیک مانگتا ہے، کوئی کسی کے گھر پڑھاتا ہے، ایسے لوگوں کو روٹی دینا اور مدرسہ کا نام کرنا صرف روپیہ پیسہ کا ضائع کرنا اور علم کو برباد کرنا ہے جس میں ذرا ثواب نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ آپس میں نہایت نا اتفاقی ہے اور ایک دوسرے کی حقارت اور اپنی شیخی اور نمود چاہتا ہے۔ اس طرح کا اتفاق ہونا مشکل ہے۔ سرسید کہتے ہیں:

> ''تم سچ کہتے ہو، جب کسی قوم پر خدا کی غضبی ہوتی ہے اور ذلت اور ادبار آتا ہے تو ایسی ہی مت ہو جاتی ہے مگر پھر بھی تم اس کا چرچا کرنا اور کہنا کہ ایک شخص ہندوستان سے آیا تھا اور وہ ایسی ایسی باتیں کرتا تھا۔''(۴۰)

اسی طرح ایک اور موقعے پر کہتے ہیں:

''قوم کا جو ادبار ہے تو باوجود یکہ روپیہ خرچ ہوتا ہے مگر کس بری طرح خرچ ہوتا ہے جس سے نہ دین کا فائدہ نہ دنیا کا البتہ صرف چند روزہ ایک نام ہے کہ فلانے میمن کا ایک مدرسہ ہے۔''(۴۱)

سرسید کو لندن کے مشہور اتھینیم کلب کی رکنیت کا اعزاز حاصل ہوا۔اس کلب کی خصوصیت یہ ہے کوئی شخص جو صاحب تصنیف نہ ہو یا کسی اور کمال میں مشہور نہ ہو وہ اس کلب کا ممبر نہیں ہوسکتا۔ اس کلب کی خصوصیات پر ایک تفصیلی مضمون لکھنے کے بعد سرسید اپنے ہم وطنوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اے ہمارے عزیز ہم وطنوں، ہماری قوم کے جو لوگ بوڑھے ہیں وہ کے دن کے ہیں ان کو خدا جلد بہشت نصیب کرے جو جوان ہیں ان سے ہاتھ اٹھاؤ۔ جب درخت کی شاخ سخت ہوجاتی ہے تو وہ ٹوٹ جاتی ہے پر کسی طرف پھر نہیں سکتی۔ ہاں اپنی اولاد کی جو چھوٹی پود ہے خبر لو ان کی تعلیم و تربیت کی فکر کرو تمھاری حالت تمھارے باپ دادا کی حالت سے زیادہ بدتر خراب ہے اور تمھاری اولاد کی حالت تم سے بھی بہت زیادہ بدتر اور ابتر ہوگی۔ اگر تم اس کی فکر نہ کروگے تمھاری ارواح قبر میں ان کے لیے روئے گی۔''(۴۲)

سرسید کا یہ سارا سفر ایک مخلص اور متجسس انسان کی ایسی روئیداد ہے جس سے ان کے ذہن کا پتا چلتا ہے جو ہر نئی چیز کو کھلے دل و دماغ سے دیکھ رہا ہے اور مثبت و مفید پہلوؤں کو قبول بھی کر رہا ہے۔ نذیر احمد لکھتے ہیں:

''لیکن سید احمد خاں کے درد کو ہر شخص نہیں پا سکتا۔ ان میں بڑی صفت یہ ہے کہ ہم سب سے پہلے زمانے کی رفتار کو پہچانتے اور مسلمانوں کو آگاہ کر دیتے ..... جو کچھ سید احمد خاں کہتے ہیں مسلمان اگر دنیا میں رہنا چاہیں گے تو کریں گے اور اس سے بڑھ کر کریں گے، مگر ابھی نہیں۔ اچھی طرح مٹ لیں گے۔ پیٹ بھر کر خراب ہولیں گے، تب کہیں جا کر سمجھیں تو سمجھیں۔ میں جانتا ہوں اور افسوس کرتا ہوں کہ سب لوگ کیوں نہیں جانتے کہ سید احمد خاں کے دل میں انگریزی وضع کی ذرا بھی وقعت نہیں۔''(۴۳)

سرسید ایمان کی حد تک اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ جب تک کوئی قوم خود اپنی بھلائی اور ترقی و تہذیب کی طرف متوجہ نہیں ہوتی کبھی اس کو عزت و ترقی نصیب نہیں ہوتی۔(۴۴)

سفرنامہ لندن کے مابعد اثرات

سرسید احمد خان نے ۱۸۷۰ء میں انگلستان کے سفر سے واپس آ کر اپنے ''عمل'' کا آغاز دو چیزوں سے کیا۔ ایک یہ

کہ مسلمانوں کو تقلیدی دائرے سے نکال کر ان کے اخلاق کی تہذیب و درستی کے لیے ۱۸۷۰ء میں ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم دینے کی تیاری کے لیے ''کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان'' بنارس میں قائم کی۔ انھوں نے لندن ہی سے ''تدابیر ترقی تعلیم مسلمانان'' کی اشاعت کے لیے ایک اشتہار چھپوا کر اپنے چلنے سے پہلے محسن الملک کو بھجوا دیا تھا۔ یہ دونوں منصوبے لندن میں سوچ کر انھوں نے تیار کیے تھے اور یہ حصولِ مقصد کی طرف ان کا پہلا قدم تھا۔ ۲۴ ستمبر ۱۸۷۰ء کو ''تہذیب الاخلاق'' کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔(۴۵) اس پرچے کی لوح وہ لندن ہی سے تیار کروا کے لائے تھے۔

سرسید کے اس سفرنامے نے اپنے اثرات مرتب کیے۔ سرسید کی محنت رنگ لائی اور ہندوستان سے کئی نوجوان اعلیٰ تعلیم کے لیے عازمِ لندن ہوئے۔(۴۶)

ہم اپنے اس مقالے کو سرسید ہی کے ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں:

> ''یارانِ وطن ضرور وہ دن آنے والا ہے کہ کبھی تم ہم کو یاد کرو گے گو اس وقت ہم نہ ہوں گے مگر تمھارے جام عشرت سے جو شراب دانستہ یا نادانستہ چھلک کر زمین پر گرے گی اسی سے میری روح خوش ہوگی اور ان شاء اللہ العزیز بہشت بریں میں ان اشعار سے ترانہ سنج ہوگی۔
>
> مجھے یہ زور ہے ساقی کی کل ادا بھائی
> کہ پہلے جام سے مے خاک پر چھڑکوائی
> جو میں نے پوچھا تو کہنے لگے کہ سودائی
> چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی
> بیاد آر محبان بادہ پیما را
>
> اے یارانِ وطن رات تھوڑی، حسرت دل میں بہت، صلح کیجیے بس لڑائی ختم ہو چکی شکوہ و شکایت ختم ہوئے گلے مل لیجیے وہ صفائی ہوگئی اب اپنے ملک کی بھلائی پر متوجہ ہوجایئے اپنے ملک کے بچوں کی تربیت کا بندوبست کیجیے اور جو جو واجبی الزام ہمارے ملک پر ہیں ان کو مٹایئے اور دنیا میں اپنے ملک کو تربیت یافتہ اور شائستہ ملک کر دکھایئے اور حیلوں بہانوں کو اٹھا رکھیے۔''(۴۷)

حواشی

(۱) سرسید احمد خان، مسافرانِ لندن، مرتبہ: پروفیسر ڈاکٹر اصغر عباس، کراچی: ادارہ یادگارِ غالب، ۲۰۱۵ء، ص ۲۲۸

(۲) مثلاً شیخ اعتصام الدین (۱۷۶۵ء)، میر لندنی ابوطالب اصفہانی (۱۷۹۹ء)، یوسف کمبل پوش (۱۸۳۷ء)، نواب کریم خاں

(۱۸۴۰ء)، مسیح الدین علوی کاکوروی (۱۸۵۶ء)۔ حوالے کے لیے دیکھیے: مسافرانِ لندن، ص ۸۔۹

(۳) ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، لاہور: مجلس ترقی ادب، ج ۴، ص ۸۱۸۔۸۱۹

(۴) سفرنامہ لندن، محولۂ بالا، ص ۹

(۵) ایضاً، ص ۸

(۶) ایضاً، ص ۲۰

(۷) ایضاً، ص ۱۷۶

(۸) ایضاً، ص ۱۵

(۹) تاریخ ادب اردو، محولۂ بالا، ج ۴، ص ۸۱۹

(۱۰) سفرنامہ لندن، محولۂ بالا، ص ۲۱

(۱۱) ایضاً، ص ۱۹

(۱۲) ایضاً، ص ۵۸

(۱۳) ایضاً، ص ۵۶۔۵۹

(۱۴) ایضاً، ص ۶۷۔۶۸

(۱۵) ایضاً، ص ۷۷

(۱۶) ایضاً، ص ۱۳۳

(۱۷) ایضاً، ص ۱۳۶

(۱۸) ایضاً، ص ۱۰۰

(۱۹) ایضاً، ص ۱۰۰

(۲۰) ایضاً، ص ۱۰۳

(۲۱) ایضاً، ص ۱۸

(۲۲) ایضاً، ص ۱۲۰

(۲۳) ایضاً، ص ۱۶

(۲۴) ایضاً، ص ۸۵

(۲۵) ایضاً، ص ۷۷

(۲۶) ایضاً، ص ۹۴

(۲۷) دیکھیے: سمندر کنارے شیخ اسماعیل سے ان کی بات چیت، مسافران لندن، ص ۸۷، نیز ص ۹۰، نیز الحاج احمد بکری سے گفتگو، ص ۹۵، فرانسیسی انجینئر مسٹر ڈی لسپس (M. D. Lesseps)، ص ۹۹

(۲۸) مسافرانِ لندن، محولۂ بالا، ص ۱۵۸

(۲۹) ایضاً، ص ۱۰۸۔۱۰۹

(۳۰) ایضاً، ۱۰۹۔۱۱۴

(۳۱) ایضاً، ص ۴۴۔۴۵

(۳۲) ایضاً، ص ۴۸۔۵۰
(۳۳) ایضاً، ص ۹۶۔۹۷
(۳۴) ایضاً، ص ۱۱
(۳۵) ایضاً، ص ۱۲۲۔۱۲۳
(۳۶) ایضاً، ص ۱۲۴
(۳۷) ایضاً، ص ۱۴۳
(۳۸) ایضاً، ص ۱۴۷
(۳۹) ایضاً، ص ۱۴۹۔۱۵۰
(۴۰) ایضاً، ص ۴۰۔۴۱
(۴۱) ایضاً، ص ۴۳
(۴۲) ایضاً، ص ۱۸۸
(۴۳) احمد، ڈپٹی نذیر، رویائے صادقہ، دہلی: منذر احمد، دہلی ۱۹۴۰ء، ص ۹۰
(۴۴) مسافرانِ لندن، *محولۂ بالا*، ص ۱۶۲
(۴۵) تاریخِ ادبِ اردو، *محولۂ بالا*، ج ۴، ۸۲۰
(۴۶) دیکھیے: علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۱۸/ مارچ ۱۸۷۰ء
(۴۷) مسافرانِ لندن، *محولۂ بالا*، ص ۲۷۴

مآخذ:

(۱) احمد، نذیر، ڈپٹی، رویائے صادقہ، دہلی: منذر احمد، دہلی ۱۹۴۰ء
(۲) جالبی، جمیل، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، لاہور: مجلس ترقی ادب، ج ۴،
(۳) خان، سید احمد، سر، مسافرانِ لندن، مرتبہ: پروفیسر ڈاکٹر اصغر عباس، کراچی: ادارہ یادگارِ غالب، ۲۰۱۵ء

جرائد

(۱) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۱۸/ مارچ ۱۸۷۰ء